اقبال کا نظامِ فکر

رفیع الدین ہاشمی

جب ہم اقبال کے نظامِ فکر کی بات کرتے ہیں تو بظاہر یہ ایک واضح بات معلوم ہوتی ہے۔ فلسفیانہ موشگافیوں سے قطع نظر کیجیے تو ہم یوں کہیں گے کہ اقبال ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے ان کی فکر اسلامی ہے اور ان کے نظامِ فکر سے مراد نظام اسلامی ہے اور اقبال کے نزدیک خودی، عشق، فقر، غیرت، درویشی، قہاری، غفاری، جبروت، یقین محکم، عمل پیہم، اخوت، محبت اور اتحاد وغیرہ وہ اجزا ہیں جن کی ترکیب سے یہ نظام تشکیل پاتا ہے ــــ مگر اس وضاحت کے باوجود میرے خیال میں اقبال کے نظامِ فکر کے اجزا کو متعین اور واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ دورِ حاضر میں اس وضاحت کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہو گئی ہے کہ اوّلاً: موجودہ زمانے میں ہر چیز کو، خواہ وہ کوئی عظیم شخصیت ہو یا نظامِ فکر و فلسفہ، متنازعہ فیہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوم: اس لئے کہ دورِ حاضر کے تشکیکی رجحانات کے پیش نظر ہر واضح اور شفاف چیز بھی دھندلا گئی ہے ــــ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم جانیں کہ اقبال کے نزدیک مسلمان ہونے کا کیا مفہوم ہے؟ مسلمانوں کی سربلندی اور عروج سے ان کی مراد کیا ہے؟ اسلام کے غلبہ و استیلا کا ان کے ذہن میں کیا تصور تھا اور اسلام کا جاندار فلسفہ، اقبال کے نزدیک کیا ہے؟

لیکن اہم ترین بات جو ہمیں اقبال کے نظامِ فکر کے اجزا کو واضح کرنے کی طرف مائل کرتی ہے، یہ ہے کہ اقبال کے اکثر مداحوں کے نزدیک ان کی نمایاں اور اوّلین حیثیت شاعر کی ہے۔ بلاشبہ وہ ایک عظیم شاعر تھے اور اپنی شاعرانہ عظمت کے اعتبار سے وہ یقیناً اردو شاعری کی آبرو ہیں مگر شاعری کیسی ہی عظیم کیوں نہ ہو، بہرحال وہ ایک وقتی تاثر کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ یہ تاثر عارضی ہوتا ہے۔ یہ تاثر یا خیال دائمی قدر و قیمت کا حامل بھی ہو سکتا ہے لیکن بہرحال وہ ایسے

وقت کی تخلیق ہوتا ہے جن کی حیثیت گزرتے ہوئے لمحات PASSING PHASE کی ہوتی ہے۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک وقت میں کہے ہوئے اشعار، شاعر کے ایک موڈ کا مظہر ہو سکتے ہیں تو کسی دوسرے وقت کی تخلیق کسی دوسرے موڈ کو ظاہر کر سکتی ہے۔ شاید اسی لئے ہم شعراء کے ہاں فکر و خیال کی یک جہتی اور ہم آہنگی نہ ہونے کا شکوہ کرتے ہیں۔ ہمیں شاعر اپنی فکر، اپنے خیال، اپنے لہجے اور اپنے موڈ کے لحاظ سے کئی ٹکڑوں اور حصوں میں بٹا ہوا نظر آتا ہے۔ اردو شاعری کی سب سے بڑی صنف غزل اس نقطۂ نظر کی تائید کرتی ہے۔ حتیٰ کہ کبھی کبھی ہم کسی شاعر کے ہاں "تضاد" کا بھی شکوہ کرتے ہیں جیسا کہ اقبالؔ جیسے عظیم فلسفی شاعر کے ہاں بھی تضاد کا سوال اٹھایا جاتا ہے۔ مختصراً یہ کہ شاعر ایک مفکر کی طرح اپنی فکر کی کڑیوں کو مربوط نہیں کرتا اور ایک فلسفی کی طرح اپنے فلسفے کے مختلف اجزاء کو ترتیب نہیں دیتا۔ یوں ہمیں شاعر کے ہاں بے نظمی، بے ترتیبی اور غیر ہمواری کا احساس ہوتا ہے اور اسی لئے کسی شاعر کی محض شاعری پڑھ کر ہم اس کے نظامِ فکر اور اس کے اجزاء کو متعین کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اس پس منظر میں، اقبالؔ کی شاعری کی تمام تر عظمت اور مسلمہ اہمیت کے باوجود اُن کے نظامِ فکر کے اجزاء کو مرتب شکل میں پیش کرنے کے لئے اقبالؔ کے خطوط، تقاریر، ملفوظات اور بیانات کا سہارا لینا ضروری ہے۔ یہ ساری چیزیں چونکہ نثر میں ہیں اس لئے ان میں کوئی ابہام نہیں اور یہ نسبتاً زیادہ واضح اور متعین ہیں۔

اس مضمون میں اقبالیات کے نثری ذخیرے سے فکرِ اقبالؔ کے اجزاء چن کر انہیں ایک ترتیب کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یوں سمجھیے کہ اقبالؔ جو کچھ چاہتے تھے اس کا ایک مجمل سا خاکہ بنایا گیا ہے، جسے بوقتِ ضرورت اور بشرطِ مہلت ایک مفصل نقشے کی صورت میں پھیلایا جا سکتا ہے اس طرح یہ مضمون اس عنوان کی تشریح ہے کہ "اقبالؔ کیا چاہتے تھے؟"

اقبالؔ کے نزدیک اس کائنات کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے جس کے وجود کے لئے کسی فلسفیانہ استدلال کی حاجت نہیں کیونکہ جب پیغمبرؐ نے فرمایا کہ خدا مجھ سے ہم کلام ہوتا ہے تو خدا کی ہستی یقیناً موجود ہے اور پیغمبرؐ کے بارے میں دشمن بھی کہتے تھے کہ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔[۱] اقبالؔ کے

۱۔ روزگارِ فقیر۔ جلد دوم۔ مرتبہ فقیر سید وحید الدین۔ لاہور۔ ۱۹۶۴ء۔ ص ۱۳۔

خیال میں بنی نوعِ انسان کی نجات صرف اسلام کے ذریعے ہی ممکن ہے[۲] اور اسلام ہی اس کے مستقبل کا ضامن ہو سکتا ہے۔ دورِ حاضر کے دو بڑے نظام یعنی مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے[۳]۔ اسلام کے سوا کوئی دوسرا طریقہ نہیں جس پر کاربند ہو کر بنی نوعِ انسان لسانی، نسلی اور ہر طرح کے تعصبات ختم کر سکے۔ اسلام کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ نوعِ انسانی ایک گھرانا بن جائے[۴]۔ اقبال کے نزدیک مسلم ممالک میں شریعتِ اسلامیہ کا نفاذ نہ ہونے کے سبب یہ مقصود حاصل نہیں ہو سکا۔ شریعتِ اسلامیہ اس لئے نافذ نہ ہو سکی کہ حقیقی معنوں میں ایک آزاد اسلامی ریاست اب تک وجود میں نہیں آ سکی[۵]۔ پس اقبال کے نزدیک ایک مسلمان کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ احیائے اسلام اور حفاظتِ اسلام کی پوری قوت سے کوشش کرے[۶]۔ اس کا کوئی فعل ایسا نہ ہونا چاہیئے جس کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ کے سوا کچھ اور ہو[۷]۔

اقبال اسلام کو ایک جامع اور مکمل ضابطۂ حیات سمجھتے تھے جس نے زندگی کے ہر شعبے میں مسلمان کی پوری پوری رہنمائی کی ہے۔ ان کے نزدیک اسلام کا تصورِ سیاست و حکومت دوسرے تمام نظریات سے مختلف ہے جس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ سیاسیات کی جڑ انسان کی روحانی زندگی میں ہوتی ہے[۸] کیونکہ ذاتِ انسانی بجائے خود ایک وحدت ہے۔ وہ مادے اور روح کی کسی ناقابلِ اتحاد ثنویت کے قائل نہیں[۹]۔ دین نہ قومی ہے، نہ نسلی، نہ انفرادی اور نجی بلکہ خالصتاً انسانی ہے[۱۰]۔ اسلام بحیثیت مذہب کے دین و سیاست کا جامع ہے یہاں تک کہ ایک پہلو کو دوسرے پہلو سے جدا

۲۔ مجموعہ مکاتیبِ اقبال (جلد دوم) مرتبہ: شیخ عطاء اللہ، لاہور ۱۹۵۱ء۔ ص ۳۱۴۔
۳۔ گفتارِ اقبال۔ مرتبہ: محمد رفیق افضل، لاہور ۱۹۶۹ء۔ ص ۷
۴۔ ———— ایضاً ———— ص ۲۳۵
۵۔ مجموعہ مکاتیبِ اقبال، جلد دوم ص ۱۶
۶۔ انوارِ اقبال، مرتبہ بشیر احمد ڈار، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۱۹۲
۷۔ ״ ״ ״ ص ۶۲
۸۔ حرفِ اقبال، مرتبہ لطیف احمد شروانی، لاہور ۱۹۴۷ء، ص ۹
۹۔ حرفِ اقبال: ص ۲۰
۱۰۔ حرفِ اقبال: ص ۲۵۲۔

کرنا حقائقِ اسلامیہ کا خون کرنا ہے[11]۔ اقبالؔ کے خیال میں اہلِ یورپ کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے مذہب و حکومت کو علیحدہ علیحدہ کر دیا۔ اس طرح ان کی تہذیب روحِ اخلاق سے محروم ہو گئی اور اس کا رُخ دہریانہ مادیت کی طرف پھر گیا[12]۔ اسلامی نظامِ حکومت نہ جمہوریت ہے نہ ملوکیت، نہ اِسٹوکریسی اور نہ تھیاکریسی بلکہ وہ ایک ایسا مرکب ہے جو اُن تمام کے محاسن سے متصف اور قبائح سے منزہ ہے[13]۔ اسلام کے غلبے سے مراد اسلام کے عالمگیر نظامِ سیاست کا غلبہ ہے جس کی اساس وحی و تنزیل پر ہے[14]۔ غلبۂ اسلام اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر بغیر طاقت کے ممکن نہیں۔ اشاعتِ حق کے لئے شمشیر کا استعمال ناگزیر ہے[15]۔ اس سلسلے میں امتِ مسلمہ کے نوجوانوں پر خاص ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں[16]۔ اسلامی نظامِ سیاست و حکومت کے اس تصور میں وطنی قومیت کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ اقبالؔ کے الفاظ میں یہ نظریہ اس زمانے میں اسلام اور اسلامیوں کا سب سے بڑا دشمن ہے[17] اور یہ فرنگی سیاست کا نظریہ ہے[18]۔ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں[19]۔ نیشنلزم کا تجربہ یورپ میں ہوا۔ اس کا نتیجہ بے دینی اور لامذہبی کے سوا کچھ نہ نکلا[20]۔ مگر افسوس یہ کہ مسلم علماء بھی اس لعنت میں گرفتار ہیں[21]۔ اس ضمن میں یہ بات بہت اہم ہے کہ اقبالؔ کے تمام تر سیاسی افکار و نظریات کی بنیاد حق و صداقت کی جامع کتاب قرآن پاک ہے[22]۔

جہاں تک اقتصادی و معاشی مسائل کا تعلق ہے، اقبالؔ کے نزدیک قرآن پاک کی اقتصادی تعلیم ہی ہمارے معاشی مسائل کا حل ہے۔ افسوس کہ مسلمان یورپ کی پولیٹیکل اکانومی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں[23]۔ اگر اسلامی قانونِ معیشت کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص

۱۱۔ مجموعہ مکاتیبِ اقبالؔ (دوم)، ص ۳۹۳۔ (۱۲)۔ گفتارِ اقبال۔ ص ۲۵۴۔
۱۳۔ ملفوظاتِ اقبالؔ مرتبہ محمود نظامی لاہور ص ۱۷۲۔ (۱۴)۔ حرفِ اقبالؔ، ص ۲۱۔
۱۵۔ ملفوظاتِ اقبالؔ، ص ۱۴۷۔ (۱۶)۔ ملفوظاتِ اقبالؔ، ص ۱۴۲۔
۱۷۔ انوارِ اقبال، ص ۱۷۶۔ (۱۸)۔ انوارِ اقبال، ص ۱۶۷۔
۱۹۔ حرفِ اقبالؔ، ص ۲۴۹۔ (۲۰)۔ گفتارِ اقبالؔ، ص ۱۱۷۔
۲۱۔ حرفِ اقبالؔ، ص ۲۴۹۔ (۲۲)۔ گفتارِ اقبالؔ، ص ۱۳۶۔
۲۳۔ گفتارِ اقبالؔ، ص ۸۔

کم از کم معمولی معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے[۲۴]۔ اقبال کے نزدیک ہندوستان میں تہذیب اسلامی کا مستقبل معاشی مسائل سے زیادہ اہم ہے[۲۵]۔

اسلام کے نظام معاشرت میں اقبال عورت کو خاص اہمیت دیتے ہیں کیونکہ کسی قوم کی بہترین روایات کا تحفظ بہت حد تک اس قوم کی عورتیں ہی کر سکتی ہیں[۲۶]۔ یورپ نے عورت کو جس طرح گھر کی چار دیواری سے باہر نکال کر رسوا کیا، اقبال کے نزدیک انتہائی غلط تھا کیونکہ عورت پر قدرت نے اتنی اہم ذمہ داریاں عائد کر رکھی ہیں کہ اگر وہ ان سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے تو اسے کسی دوسرے کام کی فرصت ہی نہیں مل سکتی۔ عورت کو جس کا اصل کام آئندہ نسل کی تربیت ہے، ٹائپسٹ یا کلرک بنا دینا نہ صرف قانون فطرت کی خلاف ورزی ہے بلکہ انسانی معاشرہ کو درہم برہم کرنے کی افسوسناک کوشش ہے[۲۷]۔ اقبال مخلوط تعلیم کے خلاف تھے[۲۸]۔ ان کے خیال میں مسلمان عورتوں کے لئے بہترین اسوۂ فاطمۃ الزہرا ہیں۔ مسلم خواتین کو ان کی تلقین یہ تھی کہ کامل عورت بننا ہو تو فاطمۃ الزہرا کی زندگی پر غور کرنا چاہیئے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی سعی کرنی چاہیئے۔ صرف اسی طرح عورت اپنی انتہائی عظمت تک پہنچ سکتی ہے۔[۲۸ الف]

اقبال نے اسلام کا جو جامع تصور پیش کیا، ہندوستان (متحدہ) میں اس کی بقا اور حفاظت نیز مسلمانوں کے احترام و اقتدار کا انحصار اس بات پر منحصر ہے کہ ایک آزاد اسلامی ریاست قائم ہو جو شریعت اسلامیہ نافذ کر کے اسلام کی حفاظت کر سکے[۲۹]۔ اگر موجودہ حالت کی اصلاح کی طرف توجہ نہ کی گئی تو یہاں مسلمانوں اور اسلام کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا اس صورت میں خدشہ ہے کہ کہیں ان کی زندگی گونڈ اور بھیل اقوام کی طرح نہ ہو جائے اور رفتہ رفتہ ان کا دین اور کلچر اس ملک سے فنا نہ ہو جائے[۳۰]۔ یہ خدشہ اقبال کو اس لئے ہے کہ مسلمانوں کو ابھی تک احساس زیاں

۲۴۔ مجموعہ مکاتیب (جلد دوم)، ص ۴۷۔ (۲۵)۔ مجموعہ مکاتیب اقبال (جلد اول) ص ۱۱۔

۲۶۔ گفتار اقبال، ص ۷۵۔ (۲۷)۔ روزگار فقیر (جلد اول) لاہور ۱۹۶۳ء، ص ۷۹۔

۲۸۔ روزگار فقیر (جلد اول) ص ۱۶۵۔ (۲۸ الف)۔ گفتار اقبال، ص ۸۳۔

۲۹۔ مجموعہ مکاتیب اقبال (جلد دوم) ص ۱۶ و ۲۸۶۔ (۳۰)۔ مجموعہ مکاتیب اقبال (جلد دوم) ص ۲۸۴۔

نہیں[31]۔ مسلمانوں کے سارے ہی طبقے اس احساس سے عاری ہیں۔ علماء میں مداہنت آگئی ہے، صوفیہ اسلام سے بے پروا اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت کے سوا کوئی مقصد اعلیٰ کی زندگی کا نہیں[32]۔ وہ کہتے ہیں میرا متعدد عمر کا مطالعہ اور مشاہدہ مجھے یقین دلا چکا ہے کہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمان بالکل بیکار ہیں[33]۔ دنیوی جاہ و منصب کے لالچ میں مسلمان بزرگوں کی اولادیں جاہل ہو چکی ہیں[34]۔ اجتماعی اداروں کو مسلمانوں نے اغراض کے حصول کا ذریعہ بنالیا ہے[35]۔ اُن کے لیڈر خود غرض ہیں اور ایثار نہیں کر سکتے[36]۔ جہاں تک مغرب زدہ مسلمانوں کا تعلق ہے، اقبالؔ انہیں نہایت قریب سے دیکھنے کے بعد اس نتیجے تک پہنچے کہ یہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے[37]۔ مسلمانوں کی تباہی کا ایک بڑا سبب عجمیت ہے جس کا اثر مذہب، لٹریچر اور عام زندگی پر غالب ہے۔ عربوں اور افغانوں کے سوا تمام اقوام اسلامیہ اس زہر سے خطرناک حد تک متاثر ہو چکی ہیں[38]۔ ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے عجمی اثرات کے زیر اثر ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی عجمی ہیں اور سوشل نصب العین بھی عجمی ہیں[39] (اس "باطل" کے خلاف جہاد کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے[40])۔

اقبالؔ کے نزدیک اس صورتِ حال کا اصلی سبب، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، یہ ہے کہ حقیقی معنوں میں ایک آزاد اسلامی ریاست قائم نہیں ہو سکی جو شریعتِ اسلامیہ کو پوری طرح نافذ کرتی۔ مسلم دورِ حکومت میں اوّل تو خاطر خواہ طریقے سے اسلام پھیلا ہی نہیں[41] اور جو لوگ مسلمان ہوئے بھی تو ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام مناسب طریقے سے نہیں کیا گیا[42]۔ اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اقبالؔ کے

۳۱۔ مجموعہ مکاتیب اقبالؔ (جلد دوم)، ص ۲۸۷۔
(۳۲)۔ مجموعہ مکاتیب اقبالؔ (جلد اوّل)، ص ۲۵۰۔
۳۳۔ ملفوظاتِ اقبالؔ، ص ۱۴۱۔
(۳۴)۔ مجموعہ مکاتیب اقبالؔ (جلد اوّل)، ص ۲۳۱۔
۳۵۔ مجموعہ مکاتیب اقبالؔ (جلد اوّل)، ص ۱۳۷۔
(۳۶)۔ ملفوظاتِ اقبالؔ، ص ۳۱۔
۳۷۔ ״ ״ ״ ص ۱۹۹۔
(۳۸)۔ انوار اقبالؔ، ص ۱۹۲۔
۳۹۔ مجموعہ مکاتیب اقبالؔ (جلد اوّل)، ص ۲۴۲۔
(۴۰)۔ انوار اقبالؔ، ص ۱۹۲۔
۴۱۔ روزگارِ فقیر (جلد دوم)، ص ۲۰۲۔
(۴۲)۔ مجموعہ مکاتیب اقبالؔ (جلد دوم)، ص ۹۹ و روزگارِ فقیر (جلد دوم)، ص ۲۰۲

نظامِ فکر میں ہمیں جو تدابیر ملتی ہیں انہیں فرد اور جماعت کے دو سطحوں سے متعدد انداز میں اور مختلف سطحوں پر بیان کیا جا سکتا ہے مگر اصلاحِ احوال کا مرکزی نقطہ یہی ہے کہ مسلمانوں کی مناسب تربیت کی جائے اور شریعتِ اسلامیہ کو بہ تمام و کمال نافذ کیا جائے۔

اقبال کے نظامِ فکر میں بنیادی بات یہ ہے کہ مسلمان ہونا اور اسلام پر ایمان کسی دلیل کا محتاج نہیں بلکہ اس کی تمام تر بنیاد سمع و طاعت پر ہے چنانچہ ایک بار کسی نے اقبال سے پوچھا کہ حج کی غرض و غایت کیا ہے؟ فرمایا، بس خدا کا حکم ہے[42]۔

انفرادی سطح پر اقبال کا فرد سے مطالبہ یہ ہے کہ وہ اپنے ذاتی اور شخصی میلانات، رجحانات اور تخیلات کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرے اور اس پابندی کے نتائج سے بالکل بے پروا ہو جائے محض رضا و تسلیم کو اپنا شعار بنائے[43]۔ فرد کے لئے ارکانِ اسلام کی پابندی ضروری ہے کیونکہ کسی قوم کی تشکیل و تعمیر کے لئے اسلام کے پانچ ارکان کا اجرا و انضباط ضروری ہے[45]۔ اس پابندی سے روح کو وہ تدریجی تربیت حاصل ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس میں تبتل الی اللہ کی قابلیت پیدا ہوتی ہے اور اسی کا نام اسلامی تصوف ہے[46]۔ پھر فرائض سے آگے بڑھ کر نوافل، شب بیداری اور خاص طور پر تہجد کے اہتمام سے عبادتِ الٰہی کی حقیقی لذت نصیب ہوتی ہے[47]۔ انسان صحیح معنوں میں مسلم اس وقت ہوتا ہے جب قرآن کے اوامر و نواہی اس کی اپنی "خواہش" بن جائیں[48]۔ انسان کا رزق خدا کے ہاتھ میں ہے[49]۔ خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیئے کیونکہ سارے معاملات خدا کے ہاتھ میں ہوتے ہیں[50]، اس سے طبیعت میں سکون پیدا ہوتا ہے[51]۔ سچے مسلمان کو ہر حال میں اپنے وعدے کا پاس کرنا چاہیئے[52]۔ اقبال کے نزدیک ایک

۴۲۔ روزگار فقیر (جلد اوّل)، ص ۱۷۔ (۴۳)۔ مجموعہ مکاتیب اقبال (جلد دوم)، ص ۶۰

۴۵۔ ملفوظاتِ اقبال، ص ۲۰۹۔ (۴۶)۔ انوارِ اقبال، ص ۲۷۹۔

۴۷۔ مجموعہ مکاتیب اقبال (جلد دوم)، ص ۱۹۳۔

۴۸۔ مکاتیبِ اقبال بنام گرامی۔ مرتبہ: محمد عبداللہ قریشی، لاہور اپریل ۱۹۶۹ء، ص ۹۳

۴۹۔ روزگار فقیر (جلد دوم)، ص ۱۸۴۔ (۵۰)۔ مکاتیب بنام گرامی، ص ۱۴۷۔

۵۱۔ مکاتیب بنام گرامی، ص ۹۴۔ (۵۲)۔ روزگار فقیر (جلد اوّل)، ص ۸۰۔

مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ سچی بات کے ظاہر کرنے میں اختصار سے کام نہ لے اور اسے گناہِ عظیم جانے[٥٣] کلمۂ حق کہنے سے باز نہ رہے[٥٤] بلکہ اگر ضرورت پڑے تو اُسے اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت دینا چاہیے۔ کیونکہ اقبال کے الفاظ میں مسلمان ایسا پتھر ہے کہ جس پر گرتا ہے اُسے پاش پاش کر دیتا ہے اور جو اُس پر گرتا ہے، پاش پاش ہو جاتا ہے[٥٥]۔ اُن کے خیال میں ضرورت سے زیادہ روپے کی ہوس ایک مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے[٥٦]۔ اگر اس کے پاس روپیہ ہو بھی تو فضول مصارف کو ترک کردے[٥٧] سادہ اور درویشانہ زندگی کو اپنا شعار بنائے۔ مکانوں کی آرائش اور معاشرتی زندگی میں فیشن کو راہ دینا بے معنی تکلفات کے مترادف ہے۔ ان میں نہیں اُلجھنا چاہیے[٥٨]۔ خود اقبال نے اپنے کمروں کو مغربی فیشن کے مطابق آراستہ نہیں کیا[٥٩]۔ مسلمان کی درویشی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ بڑے لوگوں کی پروا نہ کرے۔ حکام سے سفارشیں کرنا تو بہت ہی ذلت انگیز کام ہے[٦٠]۔ بحث و مباحثے سے گریز کرنا چاہیے کیونکہ اکثر اوقات بحثیں نتیجہ خیز نہیں ہوتیں[٦١]۔ کافر گری، فتوے بازی اور رکعات و اذکار پر لڑنا بے کار ہے[٦٢]۔ کیونکہ مذہبی بحث و تکرار نکمے پن کی دلیل ہے[٦٣]۔ غرض اقبال کے نزدیک اخلاقی اقدار انسانی زندگی میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ خصوصاً ایسی قوم جو حکمران ہو اُسے اپنی سیرت کے اندر ایک خاص قسم کا تدبر، عدل اور اخلاقی اوصاف پیدا کرنے چاہئیں۔ کیونکہ مروت، علو ہمت، فراخدلی، مردم شناسی اور عطا و بخشش کی اعلیٰ خصوصیات کے بغیر ایک شخص صحیح طور پر حکمران بن ہی نہیں سکتا[٦٤]۔ پھر کسی حکومت کا سب سے بڑا فرض افراد کے اخلاق کی حفاظت ہے۔ انہیں جدید دنیا کی حکمران جماعتوں سے شکوہ ہے کہ وہ اس اہم ترین فرض کو تسلیم

٥٣- مکاتیب بنام گرامی، ص ١٤٣-
(٥٤)- مجموعہ مکاتیب اقبال (جلد اول)، ص ٢٣٣-
٥٥- روزگار فقیر (جلد اول)، ص ٨٣-
(٥٦)- مجموعہ مکاتیب اقبال (جلد اول)، ص ٢٧٤-
٥٧- گفتار اقبال، ص ٤٩-
(٥٨)- ملفوظات اقبال، ص ٢٧-
٥٩- ملفوظات اقبال، ص ٧٩-
(٦٠)- مجموعہ مکاتیب اقبال (جلد اول)، ص ٣٠٩-
٦١- مجموعہ مکاتیب اقبال (جلد دوم)، ص ١٩١- (٦٢)- ملفوظات اقبال، ص ٥٢-
٦٣- ملفوظات اقبال، ص ٥٣ (٦٤)- روزگار فقیر (جلد اول)، ص ١٠٦-

بھی نہیں کرتیں اور محض لوگوں کے سیاسی خیالات و رجحانات سے تعلق رکھتی ہیں[۶۵] اقبالؔ کے نزدیک اخلاقیات کی اہمیت اس میں ہے کہ اگر کسی قوم کے نوجوان اپنا اخلاق درست کر لیں تو ان کا مستقبل شاندار ہو سکتا ہے۔[۶۶]

اخلاقی اقدار کی سربلندی اور اخلاقیات کے مقاصد کے حصول کے لئے اقبالؔ کے نظامِ فکر میں مطالعۂ قرآن، تدبر و تفکر اور دینی علوم کی تحصیل[۶۷] بہت ضروری ہے۔ ایک مرتبہ کسی نے اقبالؔ سے پوچھا کہ آپ نے مذہب، اقتصادیات، سیاسیات، تاریخ اور فلسفہ وغیرہ کے علوم پر جو کتابیں اب تک پڑھی ہیں، ان میں سب سے بلند پایہ اور حکیمانہ کتاب آپ کی نظر سے کون سی گزری ہے؟ فرمایا: قرآن کریم[۶۷ الف] اقبالؔ نے برس ہا برس قرآن پاک کو بغور پڑھا، بعض آیات اور سورتوں پر مہینوں بلکہ برسوں غور کیا۔[۶۸] قرآن پر ان کا اعتقاد اس قدر پختہ اور نظر ایسی گہری تھی کہ وہ ہمیشہ ہر معاملے میں قرآن سے استشہاد کیا کرتے تھے[۶۹] وہ مقدمۃ القرآن کے نام سے ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے۔[۷۰] ان کے نزدیک تفسیر قرآن ایک نازک کام ہے اور قرآن پاک اس اعتبار سے ایک مظلوم صحیفہ ہے کہ جسے دنیا میں اور کوئی کام نہیں ملتا وہ اس کے ترجمہ و تفسیر میں معروف ہو جاتا ہے[۷۱]۔ اقبالؔ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے لئے جائے پناہ صرف قرآن کریم ہے۔ وہ اس گھر کو صد ہزار تحسین کے قابل سمجھتے ہیں جس گھر سے علی الصبح تلاوتِ قرآن مجید کی آواز آئے۔ ان کی تاکید ہے کہ کلام مجید کا صرف مطالعہ ہی نہ کیا کرو بلکہ اسے سمجھنے کی کوشش کرو[۷۲] نوجوانوں کو ان کا مشورہ ہے کہ وہ قرآن پاک کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ کو پیشِ نظر رکھیں[۷۳]، اور اس کی عملی صورت یہ ہے کہ وہ تلاوت اور نماز کو اپنا شعار بنالیں[۷۴]

۶۵۔ ملفوظاتِ اقبالؔ، ص ۱۴۵۔

(۶۶)۔ ملفوظاتِ اقبالؔ، ص ۱۴۰۔

۶۷۔ روزگارِ فقیر (جلد دوم)، ص ۱۸۸۔

(۶۷ الف)۔ روزگارِ فقیر (جلد اول)، ص ۹۳۔

۶۸۔ مکاتیب بنام گرامی، ص ۱۲۵۔

(۶۹)۔ حرفِ اقبالؔ، ص ۲۵۶۔

۷۰۔ انوارِ اقبالؔ، ص ۲۰۹۔

(۷۱)۔ روزگارِ فقیر (جلد اول)، ص ۸۱۔

۷۲۔ گفتارِ اقبالؔ، ص ۲۱۳۔

(۷۳)۔ گفتارِ اقبالؔ، ص ۱۲۶۔

۷۴۔ گفتارِ اقبالؔ۔ ص ۲۱۴۔

علمی سطح پر اقبالؔ کے نظامِ فکر میں اہم ترین پہلو یہ ہے کہ مسلمان جدید علوم و فنون پر اس طرح توجہ دیں کہ دورِ حاضر کے جدید مسائل کو اسلام کی روشنی میں باحسن طریق حل کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں ان کے پیشِ نظر کئی اہم کام تھے۔ ان میں سب سے اہم مقدمۃ القرآن (INTRODUCTION TO THE STUDY OF QURAN) تھا جسے مکمل کر کے وہ "اسلام کے بارے میں یورپ کے تمام نظریات توڑ پھوڑ کر رکھ دینے" کا عزم رکھتے تھے[۷۵]۔ اگر یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا تو ان کے نزدیک مسلمانانِ عالم کے لئے ان کی طرف سے بہترین پیشکش[۷۶] اور حضورؐ کے دین کی ایک اہم خدمت ہوتی[۷۷]۔ وقت کی دوسری اہم ترین ضرورت اسلامی فقہ کی مفصل تاریخ کا لکھنا تھا[۷۸]۔ ان کے نزدیک قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے "جورس پروڈنس" پر تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت ثابت کرنے والا اسلام کا مجدد اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم ہوگا[۷۹]۔ مگر یہ کام ناقدانہ انداز میں ہونا چاہیئے، غلامانہ انداز میں نہیں[۸۰]۔ وہ خود بھی یہ کام کرنے کا ارادہ رکھتے تھے[۸۱]۔ فقہ کے علاوہ اسلامی تصوف کی تاریخ لکھنے پر بھی انہوں نے زور دیا[۸۲]۔ اقبالؔ نے ایک بار خود اس کام کا آغاز بھی کیا مگر ضروری مواد نہ مل سکا اور وہ ایک دو باب لکھ کر رہ گئے[۸۳]۔ اسی طرح وہ اسلام کے ثقافتی اور فلسفیانہ پہلو پر کام کرنے کی ضرورت بھی سمجھتے تھے[۸۴]۔ غرض اس طرح کے تحقیقی اور علمی کام اقبالؔ کے پیشِ نظر تھے۔

یہاں اس امر کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا اور اقبالؔ کے نظامِ فکر میں اس بات کو نمایاں اہمیت حاصل ہے کہ ہندوستان بھر میں اُن کی نگاہوں کا مرکز پنجاب تھا۔ انہوں نے مولانا شبلیؔ مرحوم کے متعلق کوشش کی کہ وہ کسی طرح پنجاب منتقل ہو جائیں۔ اسی طرح مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کو بھی اعظم گڑھ سے لاہور منتقل ہونے

۷۵۔ ملفوظاتِ اقبالؔ، ص ۲۲۶۔ (۷۶)۔ مجموعہ مکاتیبِ اقبالؔ (جلد اوّل)، ص ۳۵۸۔

۷۷۔ مجموعہ مکاتیبِ اقبالؔ (جلد اوّل)، ص ۳۴۳۔ (۷۸)۔ مجموعہ مکاتیبِ اقبالؔ (جلد اوّل)، ص ۱۴۲۔

۷۹۔ مجموعہ مکاتیبِ اقبالؔ (جلد اوّل)، ص ۵۰۔ (۸۰)۔ مجموعہ مکاتیبِ اقبالؔ (جلد اوّل)، ص ۱۴۷۔

۸۱۔ مجموعہ مکاتیبِ اقبالؔ (جلد اوّل)، ص ۲۲۰۔ (۸۲)۔ انوارِ اقبالؔ، ص ۱۸۱۔

۸۳۔ مجموعہ مکاتیبِ اقبالؔ (جلد اوّل)، ص ۵۴۔ (۸۴)۔ مجموعہ مکاتیبِ اقبالؔ (جلد دوم)، ص [illegible]۔

کی دعوت[86] دی۔ مولانا انور شاہ کاشمیری جب دیوبند سے مستعفی ہوئے تو اقبال نے انہیں بھی لاہور بلایا۔[86 الف] چودھری عبدالحق مرحوم کو مشورہ دیا کہ وہ انجمن ترقی اردو کا مستقل مستقر پنجاب ہی کو بنائیں کیونکہ اقبال کے خیال میں مسلمانوں کو اپنے تحفظ کے لئے جو لڑائیاں آئندہ لڑنا پڑیں گی۔ ان کا میدان پنجاب ہوگا۔ ان کے الفاظ میں پنجابیوں کو اس میں بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں گی ... کیونکہ اسلامی زمانہ میں یہاں کے مسلمانوں کی مناسب تربیت نہیں کی گئی مگر اس کا کیا علاج کہ آئندہ رزم گاہ یہی سرزمین معلوم ہوتی ہے۔[87] پھر اقبال کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی احیارِ اسلامی کی خواہش کا پتہ چلا تو انہیں بھی پنجاب منتقل ہونے کا مشورہ[88] دیا۔ غرض اقبال کے نزدیک تمدنِ اسلامی کے احیار کے لئے پنجاب ہی موزوں سرزمین تھی[89]، کیونکہ ان کے خیال میں دینِ حق کا نور اس مرکز سے ہندوستان کے تمام اطراف واکناف میں پھیلے گا۔[90]

چنانچہ پنجاب میں ایک علمی اور اسلامی تحقیقی ادارے کا قیام، اقبال کے نظامِ فکر کا نہایت اہم جزو ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں (متحدہ) ہندوستان میں احیاءِ اسلام کے لئے یہ ادارہ بنیاد بن سکتا ہے۔ پٹھانکوٹ میں چودھری نیاز علی صاحب نے دارالاسلام کے نام سے جو ادارہ قائم کیا تھا، وہ اقبال کی خواہش کے عین مطابق تھا اور انہیں اس کے ذریعے حفاظتِ اسلام کا مقصد پورا ہونے کی امید تھی۔[91] اسی لئے انہوں نے جامعۃ الازہر مصر سے کسی روشن خیال مصری عالم کو طلب کیا جو اس اسلامی علمی مرکز میں رہ کر فکرِ اسلامی کی تجدید کے کام میں مقامی علماء کی مدد کرے[92]۔ اس ادارے کے محققین جدید طرزِ استدلال اور تحقیق کے مطابق علمی کام کریں[93]۔ مگر اقبال کے نزدیک اسلامی ریسرچ کے لئے یورپ اور اہل یورپ سے رجوع کرنا بالکل بے سود[94] تھا۔ اقبال کے خیال میں اس ادارے کے مقاصد میں

۸۶۔ مجموعہ مکاتیب اقبال (جلد اوّل)، ص ۷۵۔ (۸۶ الف)۔ جنگ بیس بڑے مسلمان، لاہور ۱۹۷۱ء، ص ۲۷۷۔

۸۷۔ مجموعہ مکاتیب اقبال (جلد دوم)، ص ۷۹۔ (۸۸)۔ ماہنامہ 'سیارہ' اقبال نمبر ۱۹۶۳ء، ص ۲۵۔

۸۹۔ مجموعہ مکاتیب اقبال (جلد اوّل)، ص ۲۵۲۔ (۹۰)۔ مجموعہ مکاتیب اقبال (جلد اوّل)، ص ۲۵۳۔

۹۱۔ ایضاً ص ۲۴۹۔ (۹۲)۔ ایضاً " ص ۲۵۲۔

۹۳۔ انوارِ اقبال، ص ۱۸۸۔ (۹۴)۔ ایضاً " ص ۲۹۸۔

یہ بات بھی شامل تھی کہ علماء و فقہاء کو تعلیم و تربیت دی جائے[٩٥] اور ایسے علماء پیدا ہوں جو اسلام کے قانونی لٹریچر میں تحقیق و تدقیق رد یسرچ کے لئے موزوں ہوں[٩٦]

اقبال کے ذہن میں بعض دوسری اسکیمیں بھی تھیں ۔ مثلاً وہ مسلمانوں کے لئے ایک بہت بڑا نیشنل ڈیفنس فنڈ قائم کرنا چاہتے تھے جو ایک ٹرسٹ کی شکل میں ہو اور ایک کا روپیہ مسلمانوں کے تمدن اور ان کے سیاسی حقوق کی حفاظت اور دینی اشاعت وغیرہ پر خرچ کیا جائے اور وہ تمام وسائل اختیار کئے جائیں جو زمانۂ حال میں اقوام کی حفاظت کے لئے ضروری ہیں[٩٧]۔ ایک اور اسکیم یہ تھی کہ مسلمانوں کو مختلف مقامات پر دینی و سیاسی اعتبار سے منظم کیا جائے، قومی عساکر بنائی جائیں اور ان تمام وسائل سے اسلام کی منتشر قوتوں کو جمع کر کے ان کے مستقبل کو محفوظ کیا جائے ۔[٩٨]

غرض ان کے نظامِ فکر کے مختلف اجزاء پر نظر ڈالی جائے تو دو باتیں بالکل واضح ہیں ۔ ایک کہ اقبال کی زندگی کا مطمح نظر بقول ان کے ہمیشہ یہی رہا کہ مسلمان اپنی موجودہ پستی کی حالت سے نکل کر بلندی پر پہنچ جائیں ۔ اور ان میں جو کمزوریاں اور اختلافات رونما ہوگئے ہیں، وہ دور ہو جائیں[٩٩]۔ دوسرے یہ کہ اقبال احیائے اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے بارے میں پوری طرح پُر امید تھے ۔ اُن کے الفاظ میں اسلام ایک عالمگیر سلطنت کا یقیناً منتظر ہے ..... غیر مسلموں کی نگاہ میں شاید یہ محض خواب ہو لیکن مسلمانوں کا یہ ایمان ہے[١٠٠]۔ اقبال کا ایمان تھا کہ انجام کار اسلام کی قوتیں فائز اور کامیاب ہوں گی[١٠١] ۔ مگر کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان ہر طرح کی قربانی کے لئے تیار ہوں ۔ کیونکہ زندہ رہنے کے لئے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ضروری ہے ورنہ انہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں[١٠٢]

٩٥۔ مجموعہ مکاتیب اقبال (جلد دوم) ص ٢١٣۔ (٩٦)۔ مجموعہ مکاتیب اقبال (جلد اول) ص ٢٢٥۔

٩٧۔ ایضاً ص ٢٨٤۔ (٩٨)۔ ایضاً ص ٣٠٥

٩٩۔ گفتارِ اقبال ۔ ص ١٢٦۔ (١٠٠)۔ گفتارِ اقبال ۔ ص ١٢٨۔

١٠١۔ ایضاً ۔ ص ١٩۔ (١٠٢)۔ ایضاً ۔ ص ١١٨۔

اپنے سارے ایمان و ایقان کے باوجود، اپنے نظامِ فکر کو عملی شکل دینے کے لئے اقبال کے ذہن میں اگرچہ چھوٹی بڑی مختلف اور متفرق اسکیمیں تھیں مگر اندازہ ہے کہ کوئی جامع اور مفصل منصوبہ ان کے ذہن میں مرتب نہیں ہو سکا اور پھر جو مختلف اسکیمیں اور نقشے ان کے ذہن میں تھے وہ انہیں بھی کوئی حتمی شکل نہیں دے سکے جس کا سب سے بڑا سبب غالباً یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کی شخصیت صرف علمی، فکری اور فلسفیانہ تھی، عملی شخصیت نہ تھی۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہ مسلمانوں کے مستقبل کے لئے خاصے مضطرب اور فکرمند تھے اور چاہتے تھے کہ احیائے اسلام کی کوئی صورت پیدا ہو۔ اس اضطراب اور فکرمندی کا اظہار انہوں نے بار بار اکبر الٰہ آبادی کے نام اپنے خطوں میں کیا ہے[۱۰۲]۔ اس اضطراب اور بےچینی نے اقبالؒ کو مرتے دم تک بےچین رکھا۔ ان کے آخری زمانے کی یہ رُباعی، بہت مشہور ہے ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید ‏ ‏ نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سرآمد روزگارے ایں فقیرے ‏ ‏ دگر دانائے راز آید کہ ناید؟

بسترِ مرگ پر اقبالؒ اسے بار بار دُہراتے۔ وہ اپنے اس اضطراب کو امتِ مسلمہ کے لئے ایک سوال کی شکل میں چھوڑ گئے ہیں۔

۱۰۲۔ مجموعہ مکاتیبِ اقبالؒ (جلد دوم)، ص ۴۲ تا ۷۷۔